شاعری
چُنا ہم نے پہاڑی راستہ
http://www.pakistanconnections.com/ebooks
وزیر آغا

(شاعری)

ڈاکٹر وزیر آغا

چٹکی بھر روشنی!

یہ ہونا تھا' یہ ہونا تھا

کہ میں نے اک عجب

اسرار کے اندر

چلے جانے کی خواہش کی

جہاں خستہ چٹانیں جابجا بکھری پڑی تھیں

شجر پتھرا گئے تھے

کلس' مینار' گنبد بھر چکے تھے

جہاں اک دھن کا بے انت

لمبا غار تھا

جس میں ''نہیں'' کی بادشاہت تھی

میں کھنچتا جا رہا تھا غار کی جانب

اترتا جا رہا تھا اک عجب اسرار کے اندر

جہاں اک پر تھا۔۔۔۔ٹھنڈی روشنی کا

جو ''ہونے'' کی انوکھی داستاں

اندھے خلا کی لوح پر تحریر کرتا جا رہا تھا!

مجھے۔۔۔۔اسرار کے ہالے کے اندر

یوں چلے جانے کی جرات کیوں ہوئی

میں کس لیے ٹھہرا رہا

حیران ' ششدر ' بے دھڑک

واپس چلے جانے کا

میں نے کیوں نہ سوچا اس گھڑی!

اور اب یہ حال ہے میرا

کہ میں اک پر کٹے طائر کی صورت

شفا خانے کی ممتا سے بھری جھولی کے اندر

سرنگوں ہوں

مگر میں ایک چٹکی روشنی تو لے ہی آیا ہوں!!

چنا ہم نے پہاڑی راستہ!

چنا ہم نے پہاڑی راستہ

اور سمت کی بھاری سلاسل توڑ کر

سمتوں کی نیرنگی سے ہم واقف ہوئے

ابھری چٹانوں سے لڑھکنے

گھاٹیوں سے کروٹیں لینے کی

اک بگڑی روش

ہم نے بھی اپنائی

کھڈوں کی تہہ میں بہتے پانیوں سے

ہم نے چلنے کا چلن سیکھا

درختوں اور پھولوں سے

قطاریں توڑنے کی

اور ہوا سے

منہ اٹھا کر اپنی مرضی سے

کی سمتوں میں بے آرام ہونے کی ادا بھی

زماں سے ہم نے سیکھا

سب زمانوں میں رواں ہونا

ہمیں راس آ گیا قوسوں میں چلنا

افق کی سرمئی محراب پر نظریں جمائے

کسی سیدھی سڑک پر

دور۔۔۔۔۔اک بستی کے سینے سے لگے

برسوں پرانے

ہچکیاں لیتے مکاں کی سمت جانے کا جنوں

مدھم پڑا

ہم ہٹ گئے

پیڑوں کی شاخوں سے اترتی کترنوں میں

چنا ہم نے پہاڑی راستہ!

آنسو کی چلمن کے پیچھے!

ہنسی رکی

تو پھر سے "ماؤں"

پنجوں کے بل چلتی چلتی

بازو کے ریشم پہ پھسلتی

گردن کی گھاٹی سے ہو کر

کان کی دیواروں پر چڑھتی

اندر کے دالان میں کودی

اور بدن......

اک لاغر سا بیمار بدن

سارے کا سارا

ہنسی کی چڑھتی ندی کی

آفات بھری لذت کے اندر

جھٹکے کھاتا' چیخ اٹھا:

بس ابو!

روکو اس 'ماؤں' کو ابو

آگے مت آئے یہ 'ماؤں'!!

اور ابو نے

روک دیا اپنی انگلی کو

اور بلی

اک جست لگا کر

ابو کے سینے میں اتری

اور پھر

اس کے تن کی لمبی شریانوں میں

پنجوں کے بل چلتی چلتی

اس کی آنکھ میں آ پہنچی ہے

گھات لگا کر

آنسو کی چلمن کے پیچھے

بیٹھ گئی ہے

اگر گئے تم!

کبھی سمندر کنارے جاؤ تو یاد رکھنا
تمہیں وہاں کچھ نہیں ملے گا
اگر ملا کچھ
تو بس مسافت کی نیلی چادر پہ
دوریوں کی تھکن ملے گی
خود اپنا پھیلاؤ
بانہیں کھولے تمہیں بلائے گا' یاد رکھنا
کبھی سمندر کنارے جاؤ تو یاد رکھنا!

کبھی پہاڑوں پہ جا کے دیکھو
وہاں تمہیں کیا نہیں ملے گا
چمکتے چشمے' پھدکتے رستے
خمیدہ شاخوں پر سبز میوے
ہزاروں رس دار' مشک بو
ساعتوں کے پنچھی
سیہ چٹانوں کی سبز درزوں سے
جھانکتے پھول
اور پتوں پہ زرد کیڑوں کے ننھے پیکر

پہاڑ اندر پہاڑ منظر
خود اپنا تن بھی پہاڑ بن کر
چمکتے رستوں میں سینہ تانے تمہیں ملے گا!

کبھی پہاڑوں پہ جا کے دیکھو
مگر پہاڑوں کی چوٹیوں پر کبھی نہ جانا
اگر گئے تم
تو ایک شکن در شکن مسافت
تمہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر بچھی ملے گی
سفید چادر پہ کالے قدموں کی
داستاں سی لکھی ملے گی
بجز تھکن کچھ نہیں ملے گا!

رات

پچھلا پہر

ریزہ ریزہ سی آہٹ

عجب واہموں سے بھری سرسراہٹ

مرے دل کے اندر کہیں

اک سیہ خستہ در کے بتدریج کھلنے کا احساس

عجلت میں

باہر کو جاتی ہوئی کوئی شے

دور تک

رات کے آبنوسی بدن سے

اترتی

چمکتی ہوئی دھجیوں میں لگاتار بٹتی ۔۔۔ قبا

روند کر جس کو بڑھتی ہوئی

تیز سیٹی کی لرزش میں ڈھلتی ہوئی

ایک اندھی صدا!

◆◆◆

گراں تا گراں!

جو مزہ چاہت میں ہے

حاصل میں اس کا ڈھونڈنا بے کار ہے

ہو کہاں تم، کس جہاں میں

کیوں مجھے معلوم ہو

دھند میں ہو، خواب میں

یا آسماں کی قوس میں

یا موج کی گردش میں ہو

تم ہاتھ کی ریکھا کے اندر ہو کہیں

یا دور۔۔۔سناٹوں کے ٹکراؤ سے پیدا

ان سنی آواز کی ریزش میں ہو

چاہے کہیں بھی ہو

مری چاہت کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے

حلقہ موہوم میں موجود ہو!

لمس میں حدت بہت ہے

اور ستاروں کی چبھن کا بھی مجھے احساس ہے

بند مٹھی میں دبے موتی

کی لذت سے بھی ہوں میں آشنا

پر بیاں کیسے کروں

وہ لطف جو چاہت کی پھیلی باس کی

مدہوش کن ٹھنڈک میں ہے

چاہت کے ہر دم

پھیلتے آفاق کی لرزش میں ہے!!

مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں!

مہکتے' سبز' کچے راستوں پر
قدم رکھے ہیں کتنی بار ہم نے
کبھی اک زخم خوردہ شام کو
بادل کے پنجوں سے نکلتے
اور گھنے جنگل کے بالوں میں
بدن اپنا چھپاتے ہم نے دیکھا ہے
تو ہم جنگل کے اندر بھی گئے ہیں
ادھڑتے پتھروں کی کہنہ سڑکوں پر بھی ہم
میلوں چلے ہیں
کبھی اک جست بھر کر
کہکشاں کی زین سے لٹکی
رکابوں سے بھی ہم تنتھی ہوئے ہیں
کبھی ساگر کے سینے پر کھدی
آبی گزرگاہوں کو بھی روندا ہے ہم نے
کبھی صحرا کی ٹھنڈی ریت پر
اونٹوں کی رسی تھام کر بھی ہم چلے ہیں
سفر ہم نے کیا ہے
انت سے بے انت تک اکثر

یہ تم بھی جانتے ہو
مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں
تمہیں اس کی خبر شاید نہیں ہے!

سانتا کلاز

مجھے رات کی اس سیہ

ٹھنڈی خندق سے

باہر نکلنے

سنہری شعاعوں کی

لمبی چمک دار ڈاڑھی لگانے سے

روکو نہیں!

چاروں جانب مجھے ڈھونڈتا ہے اسے

ڈھونڈنا ہے مجھے

اس گلاب ایسی لڑکی کو جو

نیند کے گرم جھولے میں لیٹی

کھلونوں کے اور ٹافیوں کے

حسیں خواب تکتی ہوئی سو گئی ہے

اس کی چھوٹی سی کھٹیا کے پائے سے

لٹکا ہوا سبز تھیلا مجھے ڈھونڈتا ہے

مجھے سبز تھیلے کو بھرنا ہے

ان موتیوں سے بنے

چہچہاتے کھلونوں سے جو

اپنی آنکھوں کے اندر چھپا کر میں لایا ہوں

کہنا ہے اس سے:

مرے ہاتھ

اب کے برس کچھ نہیں لا سکے میری بیٹی

مگر میری آنکھیں تو خالی نہیں ہیں!

ساری عمر گنوا دی ہم نے!

ساری عمر گنوا دی ہم نے
پر اتنی سی بات نہ اب تک جان سکے ہم
کھڑکی کا پٹ کھلتے ہی جو
لش لش کرتا ہے
ایک چمکتا منظر ہم کو دکھتا ہے
کیا وہ منظر
کھڑکی کے چوکھٹ سے باہر
سبز پہاڑی کے قدموں میں لیٹی
اک شفاف ندی سے لگ کر
گم صم بیٹھے پتھر کا ٹھہرا منظر ہے
یا باہر کی جانب سے
کھڑکی کے اندر کا منظر دیکھ رہے ہیں؟
ساری عمر گنوا دی ہم نے!

مسافر چلتے رہتے ہیں

کبوتر۔۔۔مقبروں پر رات دن

دن رات رہتے ہیں

مسافر رک نہیں سکتے

مسافر چلتے رہتے ہیں

کبوتر۔۔۔دودھ ایسے پر

سیہ دیوار کی جالی سے آتی

دھوپ کی کنگھی سے

جب ہموار کرتے ہیں

تو بوڑھے مقبروں پر

کائی کے جنگل مہکتے ہیں

مسافر چلتے رہتے ہیں

یہ بنجارے

جنہیں بس چند لمحے ہی ٹھہرنا ہے

انہیں روکو نہیں

یہ موسمی آبی پرندے ہیں

جنہیں میلے پروں کے ساتھ اڑنا ہے

انہیں رکنا نہیں آتا

انہیں رکنا نہیں آتا

◆◆◆

کوئی امکاں نہیں ہے!

نہیں اب اس مکاں تک
چور قدموں سے بھی جانے کا کوئی امکاں نہیں ہے!

وہ رستہ جو کبھی اس گھر کے در تک
مخملیں سبزے کا اک قالین تھا
پانی کے آنچل کی طرح شفاف تھا
وہ راستہ اب زرد پتوں کے تلے
دبکا پڑا ہے
قدم اس پر کوئی رکھتا نہیں ہے
قدم رکھنے کی خواہش بھی کرو
تو چیختا ہے، کڑکڑاتا ہے
یہ کہتا ہے:
قدم تم نے رکھا مجھ پر
تو تانکے ٹوٹ جائیں گے
دیے زخموں کے یک دم جل اٹھیں گے!
مکیں سب جاگ جائیں گے!!

نہیں اب اس مکاں تک
چور قدموں سے بھی جانے کا کوئی امکاں نہیں ہے!

دھوپ کے ڈھیر لگاؤ نہ یہاں!

دھوپ کے ڈھیر لگاؤ نہ یہاں!
ابر کے چاک سے وہ آئے
تو آنے دو اسے
بھیگتی پلکوں سے
بلور کی بوندوں میں
ٹپکنے پہ مصر ہو
تو ٹپکنے دو اسے
زرم مسکان کے ریزوں میں
وہ دیوار کے روزن سے
اترنے کی کرے ضد
تو اترنے دو اسے
دھوپ کو آنے دو
جس طور وہ آنا چاہے
ہاں مگر دھوپ کو
سوکھے ہوئے پھولوں سے بنے
گجروں کی صورت میں تو
لاؤ نہ یہاں
دھوپ کے ڈھیر لگاؤ نہ یہاں!

کہانی پر بھروسا کر!

کہانی پر بھروسا کر
کہانی کار کے ہاتھوں کا
یہ سارا تماشا
داستاں میں
رنگ بھرنے 'لفظ چننے
منحنی کردار کو دہ چند کرنے کا یہ فن
گجرے کی ڈوری میں بندھی
کچی کہانی سے محبت کی نمائش کا جتن
یہ سحر کاری۔۔۔سب کی سب
پختہ 'بہت اداکاری کا حصہ ہے
تو اس سے درگزر کر
اور کالے دیو کے چنگل سے
چڑیا کو بچا
پھر دیکھ وہ کیسے فضا میں
چارسو اٹھکیلیاں کرتی 'چہکتی ہے
وہ اپنی زندگی
خود آپ کرتی ہے بسر کیسے
تو دیکھے گا
کہانی پر بھروسہ کر!

◆◆◆

بندھن

درخت دن رات کانپتے ہیں
پرند کتنے ڈرے ہوئے ہیں
فلک پہ تارے
زمیں پہ جگنو
گھروں کے اندر چھپے خزانے
کٹے پھٹے سب بدن پرانے
قدیم، چکنی، طویل ڈوری میں بند گئے ہیں
کثیف ڈر کی غلیظ مٹھی میں آ گئے ہیں!

کہاں گئے وہ دلوں کے بندھن،
گلاب ہونٹوں کی نرم قوسیں،
زمیں جو راکھی سی بن کے
سورج کے ہاتھ پر مسکرا رہی تھی
کہاں گئی وہ ہوا جو پینگیں بڑھا رہی تھی
وہ سبز خوشبو جو بند نافے
گلی گلی پھر کے بانٹتی تھی
وہ ہاتھ تھامے
نحیف جسموں کی ایک لمبی قطار جس میں

کہیں بھی کوئی ترنج نہیں تھی!

یہ کون ہیں ہم

جو سہمے پیڑوں

ڈرے پرندوں' لرزتے تاروں سے

بندھ گئے ہیں!

خود اپنے سایوں سے ڈر گئے ہیں!!

کہو وہ بات کیا ہوئی!

کہو وہ بات کیا ہوئی
وہ بات جو لبوں کو چھو کے
ہٹ گئی
کہ جیسے لب ورق ہوں
اک چٹان کے
کہو کہ اس میں کیا خطا تھی "بات" کی
خطا تو ان لبوں کی تھی
جو بات کی برہنگی سے ڈر گئے
اسے لرزتے کانپتے حروف کا
مہین سا لباس بھی نہ دے سکے
اور اب وہ بات
آنسوؤں کی دھار میں
کنوار پن کی باس میں
سفید فام ابر میں
تڑپ رہی ہے
کہہ رہی ہے
کوئی اس کو قید سے رہا کرے
کوئی تو اس کو قید سے رہا کرے!

لفظوں سے مت تولو مجھ کو!

دیکھو بھائی'

کیوں تم مجھ کو تول رہے ہو

موٹے' بھیگے' گول' رسیلے ان لفظوں سے!

میں تو اب وہ حرف ہوں جس سے

ٹیک لگائے

اک بھی بھاری' بھیشم پیکر

پگڑی باندھے

تلک سجائے

گھسے ہوئے منکوں کی

لمبی مالا پہنے کھڑا نہیں ہے

سر سے بھی اب میں نے اپنا

سارا بوجھ اتار دیا ہے

تولنا ہے تو مجھ کو تولو

ریشم کی اک کترن سے

یا خوشبو کی اک چٹکی سے

یا بادل کے اک اڑتے پر سے

لفظوں سے مت تولو مجھ کو

لفظوں کے ان بھاری وزنی باٹوں سے

مت تولو مجھ کو

جن کے اندر

سارے معنی

پتھر بن کر

بے حس، بے آواز پڑے ہیں!!

مڈوائف

آنے والے
ننھے منے
سب "خوابوں" سے کہتی ہے وہ
آ جاؤ
اور آ کر دیکھو
کتنے لوگ تمہاری خاطر
جانے کب سے جاگ رہے ہیں!

پر جب آنے والے اُس کے
نرم ملائم ریشم ایسے
ہاتھوں کی پوروں سے چمٹے
آ جاتے ہیں
وہ تن کر کہتی ہے: دیکھو
میں نے تم کو جنم دیا ہے
"ماں" کہہ کر
تم مجھے پکارو!

اور وہ اس کے

ریشم ایسے ہاتھوں میں رونے لگتے ہیں
بچھڑی ماں کی
دودھ بھری چھاتی کی خاطر
اک کہرام مچا دیتے ہیں
لیکن وہ سنتی ہی کہاں ہے
اپنے بنجر سینے سے چمٹا کر ان کو
پورے زور سے چیختی ہے:
تم میرے ہو!
تم میرے ہو!!

چھلاوہ

کتنے سوانگ بناتا ہے
کبھی سمندر، کبھی ہوا
اور کبھی دیا بن جاتا ہے
کبھی وہ بادل اوڑھ کے
سب کی پیاس بجھانے آجاتا ہے
کبھی غصیلا دریا بن کر
سب کا
سب کچھ لے جاتا ہے
کبھی دراَنتی بن کر وہ
خوشوں کو چومتا پھرتا ہے
بجری آگ نظر میں بھر کر
جنگل میں گھس جاتا ہے
کبھی وہ زہر چھڑک جاتا ہے
سارے نٹ کھٹ بچوں پر
کبھی وہ زہر زمیں کا سارا
خوشی خوشی پی جاتا ہے
ایک عجیب چھلاوا ہے وہ
کتنے روپ دکھاتا ہے!

عنکبوت

تہ در تہ جنگل کے اندر
اس کا اک چھوٹا سا گھر تھا
اور خود جنگل
شب کے کالے ریشم کے
اک تھان کے اندر
دبا پڑا تھا
چرمری آواز بنا تھا
اور شب
گورے دن کے
مکڑی جال میں جکڑی
اک کالی مکھی کی صورت
لٹک رہی تھی!

میں کیا کرتا
مجبوری سی مجبوری تھی
میں نے خود کو
گھر چھپر میں
الٹا لٹکا دیکھ لیا تھا

کتنی ہی گرہوں میں جکڑا

دیکھ لیا تھا

مکڑی جانے کہاں گئی تھی

اپنی تہوں کے اندر شاید

چھپی ہوئی تھی

میں کیا جانوں!!

ڈراوا

اب تو دن بھر
کتنی بار یہی ہوتا ہے
آئینے کے اندر کوئی
صدیوں پرانا ایک ڈراوا
میری میلی اترن پہنے
بانہیں کھولے
سر پر چرمر ٹوپی رکھے
یوگا کے آسن میں اپنے
اک پنجے پر
بگلا بن کر
آنکھوں کی درزوں سے
مجھ کو تکتا ہے
میری بھیگی سانس کی ہلکی
ٹھوکر سے بھی لرزتا ہے
تھر تھر، تھر تھر کرتا ہے
شاید مجھ سے ڈرتا ہے

◆◆◆

رڑک

نہ زخم ہی میں کوئی جلن تھی
نہ آنکھ ہی کی تہوں کے اندر رڑک تھی کوئی

نہ آسماں سے
سفید کوندا کوئی گرا تھا
نہ کالے جنگل میں برق ریزوں کی چاندنی تھی
دلوں پہ تالے پڑے ہوئے تھے
تمام اشجار مر چکے تھے
میں دیکھتا تھا
میں سن رہا تھا
مگر میں پتھر کی چپ کے نیچے دبا پڑا تھا
وہیں کہیں کوئی اور بھی تھا
نحیف کرمک
کہ جس کے ٹھنڈے بدن کے اندر
فشار کرنوں کی اک چبھن تھی
لرزتی آنکھوں میں تاب و تب تھی
جو بولتی تھی
مرے لہو میں
عجیب گرمی سی گھولتی تھی

◆◆◆

اک بے انت وجود!

اک بے انت وجود ہے اس کا
گہرے کالے مخمل ایسا
جس پر لاکھوں اربوں آنکھیں
نقش ہوئی ہیں
ان آنکھوں میں
میں اک ایسی آنکھ ہوں
جس نے
ایک ہی پل میں
سارا منظر
اور منظر کے پیچھے کا سب خالی منظر
دیکھ لیا ہے
''تکنا'' اس نے سیکھ لیا ہے!
پر وہ گہرا کالا مخمل
اس کو۔۔۔اس سے غرض نہیں ہے
کون سی آنکھ کو بینائی کا دان ملا ہے
کیا اس کا انجام ہوا ہے!!

◆◆◆

رک جاؤ تم!

رک جاؤ تم

آگے اک بے نام سمندر ریت کا ہے

جس پر لہریں

صف در صف قبروں کی صورت

دور افق کی آخری حد تک چلی گئی ہیں

شجر حجر سب ریت ہوئے ہیں

اوپر اک بے صوت فلک ہے

جس کا کوئی انت نہیں ہے

جس کی کوئی سمت نہیں ہے!

ہم کہ ازل سے

وقت کے جولاں ناقہ کے ہمراہ رہے ہیں

اب ناقہ کو رخصت کر کے

ننگے پیروں

اس پتھر پر آ بیٹھے ہیں

جہاں گھڑی کی دونوں سوئیاں

شل قدموں کے ساتھ کھڑی ہیں

رک جاؤ تم

"ہونے" کی اس سرحد پر کچھ دیر رکو

پھر سوچیں گے

کیا کرنا ہے!

گیسٹ ہاؤس

عجب مہمان ہوں میں بھی

عجب ہے یہ ٹھکانہ بھی

جو مجھ کو روز گڑیوں کا

تماشا سا دکھاتا ہے

مجھے آنکھیں جھپکتی پتلیوں کی

ان سنی باتیں سناتا ہے

معطر ساعتوں

رنگوں میں بھیگی تتلیوں کے ساتھ

میرا نام لیتا ہے

زمانہ نبض بن کر

اس کے پیکر میں دھڑکتا ہے

کبھی گرمی چمک اٹھے

تو پوروں سے بجھاتا ہے

کبھی ٹھنڈک اتر آئے

تو چھاتی سے لگاتا ہے

عجب مہمان ہوں میں بھی

عجب ہے یہ ٹھکانا بھی

کہ سب کے سامنے مجھ کو

سمندر پار سے آیا ہوا مہمان کہتا ہے

مگر آنکھیں بچا کر

میزبانی کے عوض

یہ آخری سکہ بھی مجھ سے چھین لیتا ہے

رفاقت بیچتا ہے اور محبت بھی

عجب ہے یہ ٹھکانا بھی!

ایش ٹرے

کبھی کبھی جب

راتیں بھاری ہو جاتی ہیں

تاروں کی نوکوں سے

بھوری راکھ گرانے لگتی ہیں

زخموں پر سے

ہولے ہولے

روئی ہٹانے لگتی ہیں

ہلکی ہلکی آنچ میں خود کو

خوب جلانے لگتی ہیں

تب یہ آنکھیں

میری جاگتی آنکھیں

ایک ہی پل میں

ایش ٹرے بن جاتی ہیں!

میں آنکھوں کے ویرانوں سے

پیلے پیلے ٹھنٹھ اٹھاتے

راکھ اڑاتے

خوابوں کے

ادھ جلے ہیولے چنتے چنتے

تھک جاتا ہوں
راکھ کے چر مر پنکھ لگا کر
تاروں تک اڑتا پھرتا ہوں!

بھوت!

مرے ہوؤں سے ڈرو نہیں

یہ کہا تھا تم نے

جو مر گئے

وہ زمیں کے اندر اتر گئے

ان مرے ہوؤں کی بھٹکتی پھرتی

خوشی غمی کے عذاب سہتی

نحیف روحوں سے ڈرنا کیسا۔۔۔

کہا تھا تم نے

نہیں، میں ڈرتا نہیں ہوں ان سے

بھٹکتی روحوں

زمیں کے چکر لگاتی روحوں سے خوف کیسا

جو خود پٹخنے کے کرب میں مبتلا ہوں۔۔۔ان سے

کسی کو خطرہ نہیں ہے کوئی!

مگر میں ڈرتا ہوں خشک ڈھانچوں سے

جو زمیں میں اتر گئے تھے

زمیں کے پاتوں میں پس گئے تھے

وہ خشک ڈھانچے

جو آج آسیب بن گئے ہیں

زمیں کے اندھے کنوئیں سے باہر نکل پڑے ہیں

نہیں' یہ روحیں نہیں ہیں بھائی

یہ سب دھوئیں کے کثیف حلقے ہیں

بھوت ہیں سب مرے ہوؤں کے

جو سبز دھرتی کے گرد چکر لگا رہے ہیں

جو گرم' بوجھل' مہیب سانسوں

کی برچھیوں سے

زمیں کا پنڈا اجلا رہے ہیں'

دیا زمیں کا بجھا رہے ہیں!

جعلی حروف مٹا کر دیکھو!

چہرے کی تختی پر لکھے
جعلی حروف کی زیبائی پر مت جاؤ تم
جعلی حروف کے نیچے جھانکو
دیکھو کتنے بجھے حروف کے مدھم پیکر
اندر رہ جانے کی ضد میں
پتھر بن کر
رکے کھڑے ہیں!
لیکن ان پتھر حرفوں کو
اتنا بھی معلوم نہیں ہے
خود ان کے قدموں کے نیچے
اور بھی کتنے
بجھے ہوئے حرفوں کے پیکر
گم صم بے آواز پڑے ہیں
مٹے ہوؤں کی قبروں پر جو
کتبے بن کر
نصب ہوئے ہیں!

بجھے ہوئے حرفوں کی خاطر

اندر کے زینے سے

کھٹ

کھٹ

نیچے جا کر کیا لینا ہے

جلی حروف مٹا کر دیکھو

بجھے ہوئے سب مدھم پیکر

شبنم ایسی شمعیں لے کر

آپ ہی آپ ابھر آئیں گے!

سکتہ!

اگر وہ مرحلہ آئے

ہوا جب سانس لینا بھول جائے

مسافر چلتے چلتے رک پڑے سوچے

مجھے اب کون سی منزل کو جانا ہے

پرندہ آسماں پر

دائرہ در دائرہ اڑتا

سفیدی کے مہا گرداب کے اندر اتر جائے

مندی آنکھوں میں جب

خوابوں کا اک مواج ساگر

ریت کی شکنوں میں ڈھل کر

ریت ہو جائے

اگر وہ مرحلہ آئے

تو تم اپنی نظر کی سیدھ میں تکتے چلے جانا

فقط تکتے چلے جانا

اسی مانجھے کی پیلی ڈور کی جانب

جو اپنی ابتدا اور انتہا کے

درمیاں

اک آخری امکان بن کر رہ گئی ہے!

◆◆◆

کتنی بار بلایا میں نے!

کتنی بار بلایا میں نے
لیکن اس کے لب لرزے
نہ آنکھوں میں پہچان کا کوندا لہرایا
بس ایک پل خالی نظریں اس نے
مجھ پر ڈالیں
اور پلکوں کے پیچھے جا کر
چپ کے بھاری حجرے میں آرام کیا

پر میرے ہونٹوں سے بہتے
لفظوں کا اک دھواں اڑاتا شور
چھتوں پھر چھتاروں تک پھیل گیا
پھر اور بھی اوپر
تاروں کے چھتوں سے جا کر لپٹ گیا
پھر اور بھی اونچا اڑتے اڑتے
جڑے ہوئے ہونٹوں کے
اس سنگم پر پہنچا
جس میں کوئی درز نہیں تھی
کہیں بھی کوئی شکن نہیں تھی
چپ کے گیلے گوند سے قاشیں جڑی ہوئی تھیں

◆◆◆

اک تماشا بنا دیا تو نے!

گہرے بادل کی درز سے تارا
آنکھ مارے تو ہم سمجھ جائیں
اس سے پوچھیں بتا ہمیں یہ کیا
اک تماشا بنا دیا تو نے
وہم سا ہو گیا ہمیں۔۔۔ہم نے
گہرے بادل کی نرم مٹھی میں
بند کر کے مسل دیا تجھ کو
یہ نہ جانا کہ گہرا بادل تو
محض ننھا سا چیتھڑا تھا جسے
ہم نے آنکھوں پہ باندھ رکھا تھا
کیسے پاگل تھے ہم نہ جان سکے
گہرے بادل کے چیتھڑے سے پرے
تو بدستور جگمگاتا ہے
اپنی کرنیں بکھیرتا ہے سدا
روشنی دان کرتا جاتا ہے

◆◆◆

لفظوں کی اک ڈار

لفظوں کی اک ڈار

مرے ہونٹوں پر آ کر بیٹھ گئی ہے

ڈری ہوئی ہے

کانپ رہی ہے

شاید اس کو

بھاری بھرکم شہپر کے

سائے نے پھر سے آن لیا ہے

موٹے موٹے، شور مچاتے

غلوں نے پہچان لیا ہے

کہتی ہے:

کچھ ہونے والا ہے شاید

یا شاید جو کچھ ہونا تھا

وہ ہو بھی چکا ہے

کہتی ہے:

جو ہونا تھا

وہ ہو بھی چکا ہے

اب میں اپنے سنبل ایسے

چھوٹے چھوٹے پنکھوں کی

کٹیا کے اندر

سمٹ رہی ہوں

اپنی میٹھی بولی ساری بھول گئی ہوں!

گنتے جاؤ!

گنتے جاؤ
گن گن کر تم مزے اڑاؤ
گنتے جاؤ!

اشرفیاں بکھرے تاروں کی
صبح سے گلنار فلک سے
ساگر کے کشکول میں گرتی
ٹھن ٹھن بوندیں دیناروں کی
گنتے جاؤ
اپنے ہاتھ کی
اک اک پور پہ ضرب لگا کر
زور لگاؤ
گنتے جاؤ!

زخم جو اس نے
نوک زباں سے
نوک قلم سے
میرے بدن پر ثبت کیے ہیں

ان زخموں کو کیوں گنتے ہو

یہ تو تمہارا کام نہیں ہے

اپنے پیارے پرکھوں کی

آواز میں اپنی

گنتی کی آواز ملاؤ

گنتے جاؤ!

ممتا

رات آئے تو

سب سے پہلے

بھوری گھاس کی میٹھی خوشبو

اپنی خستہ پوروں سے

مجھ کو چھوتی ہے

پھر۔۔۔اک جگنو

دیا اٹھائے

مجھ کو ڈھونڈنے آ جاتا ہے

پھر۔۔۔بادل کا جگمگ کرتا

بوجھل ٹکڑا

پانی کی اک چھاگل بن کر

میرے سوکھی پلکوں کے

جنگل کے اندر

آگ بجھانے لگتا ہے

پھر۔۔۔جیسے قرنوں پر پھیلی

تاروں کی اک پھلواری میں

نظر نہ آنے والی اک

دیوار کا سینہ شق ہوتا ہے

KitaabPoint.blogspot.com

اور میں۔۔۔اپنے تن پر

اپنے قدم جما کر

اونچا اٹھنے لگتا ہوں

کتنا اونچا اٹھ جاتا ہوں

تم کیا جانو!

اگر اپنے بدن پر......

اگر اپنے بدن پر
تم نے اس کو لکھ لیا
اس کی گھنی خوشبو میں
خود کو غرق کر ڈالا
اگر تم کو
گرہ میں باندھ کر وہ
آئینے کی زرفشاں ڈولی میں آ بیٹھی
اگر وہ واپسی کی کشتیاں ساری جلا بیٹھی
اگر ایسا ہوا
تو تم بتاؤ
کون آئے گا جو
تم کو لفظ پر چپکے ہوئے چھلکے سے
چھٹکارا دلا کر
اک پرندے کی طرح چھوڑے گا
اس اجلی فضا میں
جہاں ہر ڈبڈباتے لفظ سے
ہر آنکھ سے
اور ابر کی ہر قاش سے

سیل معانی

قطرہ قطرہ

رات دن دھرتی پہ گرتا ہے!

آخر اک دن!

اجلے اجلے کورے کاغذ
اپنے مکھ پر ہندسوں کے پھل پھول سجا کر
اپنے آپ کو
عطرِ گلاں کے چھینٹوں سے
بچشمہ دے کر
ایک مقدس بول کی میٹھی لے سے
خود کو شاداں کر کے
ناز دکھانے آ جاتے ہیں!

ناز دکھانے آ جاتے ہیں
پر ان کو پھر دیکھتے دیکھتے
جانے کیا ہو جاتا ہے
پہلے کیسوں، پھر کھاتوں
پھر غلوں میں چھپنے لگتے ہیں
پھر غلوں سے باہر آ کر
دست بہ دست سفر کرتے ہیں
میلے کالے ہاتھوں کی پوروں پر
رقص دکھاتے ہیں

کالے میلے ہاتھوں پر جو

چکنی کالک جم جاتی ہے

اس کالک سے

اپنے اجلے تن پر

دکھ کی لاکھ کتھائیں لکھواتے ہیں

مکھیاں بن کر

زخموں اور پھوڑوں سے

گاڑھا امرت رس پیتے جاتے ہیں

آخر اک دن

میل کچیل کی تہ در تہ گٹھری کے اندر

کالا دھن بن جاتے ہیں!

اب دن کی باتیں کرتے ہیں!

لو رات کی بات تمام ہوئی
اب دن کی باتیں کرتے ہیں
سب خواب تماشے دھول ہوئے
اور جگنو تارے دیپ سبھی
پرکاش کے پھیلے ساگر میں
چمکاٹ دکھانا بھول گئے
اک چاند کہ شب بھر ساتھ رہا
وہ چاند بھی گر کر ٹوٹ گیا
لو رات کی بات تمام ہوئی
اب دن کی باتیں کرتے ہیں
پھولوں کے سوجے چہروں پہ
شبنم کی چڑیاں اتری تھیں
ان چڑیوں پہ ہم سورج کے
تیروں کا نشانہ تکتے ہیں
ادھ میچی اپنی پلکوں سے
ہم گلیوں اور بازاروں میں
سونے کے ریزے چنتے ہیں
اور داغوں دھبوں شکنوں سے

دیواریں گھایل کرتے ہیں
پھر اجلے کاغذ پہ لکھی
سب کالی خبریں پڑھتے ہیں
لو رات کی بات تمام ہوئی
اب دن کی باتیں کرتے ہیں!

◆◆◆

بچپن پھر سے لوٹ آیا ہے

کتنی بار کہا تھا خود سے
مت اتنا تم تیز چلو
سب چیزیں دونوں جانب کی۔۔۔
پیڑ' پرندے' کھیت اور ٹیلے
ڈر کر تم سے
الٹی جانب بھاگ اٹھیں
اور تم اپنے کیپسول میں بیٹھے
نابینا آنکھوں سے بس بڑھتے ہی جاؤ
ایک بھی منظر دیکھ نہ پاؤ!

پر اب میں نے
جب سے اپنے شل قدموں کے ساتھ
لڑھکنا سیکھ لیا ہے
بچپن پھر سے لوٹ آیا ہے
اک اک چیز نظر آتی ہے
مجھ سے باتیں کرتی ہے
تم بھی اپنے
اڑن کھٹولے کی مٹھی سے

باہر آؤ

میرے شل قدموں سے اپنے

قدم ملاؤ

دونوں اک دوجے کو دیکھیں

اک دوجے کو

بن دیکھے تو

کتنے زمانے بیت گئے ہیں!

تجارتی ہوا

وہ دن کیسے دن تھے!

ہوا مجھ سے کہتی:
چلو ساتھ میرے
چلو دونوں مل کر تجارت کریں
دور کی سرزمینوں
لوگوں سے
پینگیں بڑھائیں
سمندر کی موجوں کو ہم پار کر کے
گھنے سرخ شہروں میں موجیں اڑائیں!

مگر میں یہ کہتا:
مجھے سمت سے کچھ بھی لینا نہیں ہے
کہ ہر سمت
ساحل پہ بیٹھی چٹانوں سے
سر پھوڑتی ہے
وہیں پھر چٹانوں کے قدموں میں
دم توڑتی ہے!

نہیں!

میں یہ کہتا:

مجھے دور دیسوں کو جانا نہیں ہے

مجھے تو سمندر کے اندر ہی رہنا ہے

وھیلوں سے اور شارکوں سے بھرے

گہرے ساگر میں چاروں طرف گھومنا ہے

مجھے ان جزیروں سے بھی دور رہنا ہے

جو میٹھے نغموں کا جادو جگائے

گھنی نیند تقسیم کرنے پہ مامور ہیں!

ہوا مجھ سے کہتی:

چلو ساتھ میرے

مگر میں سمندر کے نمکین پانی کا عادی

مجھے کیا پڑی تھی کہ میں

سر پھری اس ہوا کی کوئی بات سنتا

کسی ساحلی شہر کے پب کے اندر

لبوا یسے مشروب کی تہہ میں

تلچھٹ کی صورت شرابور ہوتا

مجھے کیا پڑی تھی!

ہٹو

سرخ مشروب کی تہہ سے
چھنگلی پہ رکھ کر نکالو نہ مجھ کو
دکھاؤ نہ سب کو!
میں ساگر کا باسی
مجھے کیا پڑی تھی
میں اک ساحلی شہر کے پب کے اندر
لہو ایسے مشروب کی تہہ میں
تلچھٹ کی صورت شرابور ہوتا
مجھے کیا پڑی تھی!

مقدس

بچے سارے دوڑے آئے

شاہ جی آئے شاہ جی آئے!

بسم اللہ میں صدقے جاؤں!

دروازے کی اوٹ سے

اک بی بی نے جھانکا

آگے بڑھ کر شاہ جی کے قدموں کو چوما

دیکھو لوگو شاہ جی آئے

ہم کیروں کی بستی میں

خود شاہ جی آئے!

پھر بچوں کو ڈانٹ دیا

جو شاہ جی کی ٹانگوں سے لپٹے

جھول رہے تھے

تب بستی کے دروازوں نے آنکھیں جھپکیں

دیکھا۔۔۔شاہ جی

اک چٹے فرغل میں لپٹے

گردن پر پیکان سجائے

ماتھے پر مہندی کا ٹیکہ

موٹی موٹی آنکھوں میں
اک صدیوں پرانی
خون میں لت پت نہ چھپائے
بستی میں کچھ دیر رکے
پھولوٹ آئے!

آج انہیں جب دفن کیا
تو ہم نے سوچا
وہ مرکب تھے
پر ہم پاپی انسانوں سے
کس درجہ وہ افضل تھے
اب کسے بتائیں!

تجھے بھی یاد تو ہوگا!

کبھی ہوا

اک جھونکا ہے جو

دیواروں کو پھاندکے اکثر

ہلکی سے اک چاپ میں ڈھل کر

صحن میں پھرتا رہتا ہے!

کبھی ہوا

اک سرگوشی ہے

جو کھڑکی سے لگ کر پہروں

خود سے باتیں کرتی ہے!

کبھی ہوا

وہ موجِ صبا ہے

جس کے پہلے ہی بوسے پر

ننھی منی کلیوں کی

نندیا سے بوجھل

سوجی آنکھیں کھل جاتی ہیں!

کبھی ہوا۔۔۔

اب کیسے بتائیں

ہوا کے روپ تو لاکھوں ہیں

پر اس کا وہ اک روپ

تجھے بھی یاد تو ہوگا

جب سناٹے

پوری پوری ٹوٹ گرے تھے

چاپ کے پاؤں اکھڑ گئے تھے

سرگوشی پر

کتنی چیخیں جھپٹ پڑی تھیں

اور پھولوں کی آنکھوں سے

شبنم کی بوندیں

فرشِ زمیں پر

چاروں جانب بکھر گئی تھیں!!

رک جاؤں تو......

رکنے لگوں تو نبض سے کی
چھٹی پرانی
اک بگھی بن جاتی ہے
کھڑکھڑ کرتی، جھٹکے کھاتی
صاف سنائی دیتی ہے!

چلنے لگوں تو نبض
نپے قدموں سے چلنا
تج دیتی ہے
موج میں آ کر
بے پتوار ہوا کی صورت
پانی کے برفاب بدن پر
پھسلن کا اک منظر بنتی جاتی ہے!

رک جاؤں تو چھوٹی چھوٹی
نظر نہ آنے والی چیزیں
خوب دکھائی دیتی ہیں
ان کے بدن کا

اک اک جوڑ نظر آتا ہے
اک اک جوڑ کی درز کے اندر
جا سکتا ہوں
شعبدہ باز کو پانسہ پھینکتے
تک سکتا ہوں!

تم کہتے ہو:
دروازہ تو بند نہیں ہے
کیوں پھر باہر رک کے کھڑے ہو
میں کہتا ہوں:
ابھی اجازت ملی نہیں ہے
مل جائے تو اندر جاؤں
شعبدہ باز کے چرنوں میں
کچھ روز میں رہ کر
اس سے اُن کا فن سیکھوں
پھر۔۔۔ منہ کھولوں
اور نام کماؤں!

◆◆◆

اک برکھا بھیگے خوابوں کی

اوس میں بھیگی
تاروں کے سیندور سے اپنی مانگ سجائے
قرنوں کو پتوار بنائے
ٹھنڈی سبز ہوا کے ڈولتے ساگر میں وہ
اپنا کمیں بجرا کھیتی
آجاتی ہے!
میری تپتی پیشانی کو
اپنے ٹھنڈے ہاتھ سے چھو کر
سرگوشی میں کہتی ہے:
کیوں تپ کا ایندھن بنے پڑے ہو؟
شعلوں کے کمبل میں لپٹے
چپکے چپکے سلگ رہے ہو
اٹھو!۔۔۔ میرے ساتھ چلو
میں دور افق کے پار تمہیں
وہ صبح دکھاؤں
جس میں لاکھوں زخم
گلابی کلیاں بن کر
لاکھوں شعلے

پھولوں کے پیکر میں ڈھل کر
دمک رہے ہیں
اک گلزار بنے بیٹھے ہیں!

اور میں اپنی
رندھی ہوئی آواز میں اس سے
اتنا یہ بس کہتا ہوں:
تم خوابوں کی برکھا میں
یونہی بھیگ رہی ہو
اوپر دیکھو!
کتنے ٹکڑے
سوکھے بے رس بادل کے
سورج کا ایندھن بنے پڑے ہیں
چپکے چپکے سلگ رہے ہیں!!

کہاں سے تم آئے ہو بھائی!

سفیدے کے، سنبل کے
اور پاپولر کے چھریرے شجر
مری جوہ میں آئے تھے جب
مری سبز دھرتی کا اک بھی پرندہ
انہیں دیکھنے، ان شاخوں میں
آرام کرنے کو تیار ہرگز نہیں تھا
کبھی کوئی بھولے پروں والی
اک پھول سی فاختہ
ان کی شاخوں کی جانب امنڈتی
تو بو سے پریشان ہو کر
فلک کی طرف تیر بن کر
کچھ اس طور جاتی
کہ جیسے واپس زمیں پر نہیں آئے گی

اور اب حال یہ ہے
پھلاہی کے، کیکر کے، بیری کے سب پیڑ
ان آنے والوں سے گھبرا کے
جانے کہاں چل دیے ہیں

گھنے، سبز شیشم کے چھتنار مرجھا گئے ہیں
اگر کوئی گرگد یا چیپل کا
اک آدھ پنکل
کسی کونے کھدرے میں
آنکھوں کو میچے
پروں کو سمیٹے کھڑا ہے
تو کیا ہے!
اسے کب کسی آنے والے
چلے جانے والے سے کوئی تعلق رہا ہے؟

جو یوں ہے تو آؤ چلیں
آنے والوں سے چل کر ملیں
ان سے پوچھیں:
کہاں سے تم آئے ہو بھائی
ارادہ ہے کب تک یہاں ٹھہرنے کا؟

تھکن

گھٹنوں پہ رکھ کر ہاتھ اٹھی

تھکی آواز میں بولی:

بہت لمبا سفر ہے

عمر کے منہ زور دریا کا

اکھڑتے پتھروں

چکنی، پھسلتی ساعتوں کا یہ سفر

مشکل بہت ہے!

تھکن

بوجھل، منوں بوجھل بدن اپنا

اٹھا کر چل پڑی، چلتی رہی

پھر ایک دن

بھاری پپوٹوں کو اٹھا کر

اس نے دیکھا

راستے کے بیچ اک برگد

سمادھی اوڑھ کر بیٹھا ہوا تھا

تھکن

کبڑے عصا کو ٹیکتی

برگد کے سایے میں چلی آئی

معاً ٹھٹھکی

ٹھٹھک کر رک گئی

بولی:

ارے تم ہو!

چلو ہم بھی یہاں رک کر

تمہارا ساتھ دیتے ہیں

سمادھی اوڑھ لیتے ہیں

چلو ہم بھی اترتے ہیں

خود اپنی تہہ کے اندر

اور خود کو ڈھونڈتے ہیں

تاابد

اس نیند کے دریا میں ہم بھی اونگھتے ہیں!

تھکن

گھٹنوں پہ رکھ کر ہاتھ اٹھی!

کہا: اکتا گئے ہو تو

کہا: لو ہم تو چلتے ہیں!

تم اپنے دائرے میں

بت بنے بیٹھے رہو
ہم وقت کی تلوار پر
چھرے اترتے ہیں!
بہت لمبا سفر ہے
عمر کے منہ زور دریا کا!!

ریزہ ریزہ کر جاتا ہے!

لمحوں کے ریزوں کی
ہلکی بارش میں
سب۔۔۔کتنے خوش خوش پھرتے ہیں
یہ کون بتائے
جب لمحوں کے
نظر نہ آنے والے ریزے
جڑ جاتے ہیں
کیسے۔۔۔ایک پہاڑ سا لمحہ
بن جاتے ہیں
جو چپکے سے
اپنی لمبی اور چمکیلی دم لہراتا
آ جاتا ہے
سر پر دھم سے آ گرتا ہے
ریزہ ریزہ کر جاتا ہے!